بقلم ضیاء الدین لاہوری

کیا واقعی سرسید احمد خان دوقومی نظریہ کے بانی تھے؟

پاکستان کا قیام " دوقومی نظریہ " کے نعرہ کی بنیاد پر عمل میں آیا۔ اگر چہ برصغیر میں آزادی سے قبل دو سے زیادہ قومیں آباد تھیں مگر " دوقومی نظریہ " کی اصطلاح اس وجہ سے استعمال ہوئی کہ اس علاقہ میں ہندواور مسلمان دوسری قوموں کی نسبت واضح اکثریت رکھتے تھے اور دونوں اپنی اپنی جگہ قابل ذکر اہمیت کے حامل تھے۔ یہی دوقومیں اس خطے کے وسیع رقبوں پر حکومت کرنے کی اہل سمجھی جاسکتی تھیں کیونکہ مسلمانوں کی آمد سے قبل یہاں کے مختلف علاقوں میں ہندو راجے اور مہاراجے حکمران تھے۔ تقریباً ایک ہزار سال قبل مسلمان حملہ آوروں نے ادھر کا رخ کیا اور یکے بعد دیگرے ان کے علاقوں پر قابض ہونے لگے۔ یہ سلسلہ کئی صدیوں تک جاری رہا۔ بالآخر انگریز قوم تاجروں کے بھیس میں ہندوستان میں داخل ہوئی اور اپنی حکمت عملیوں سے کام لے کر آہستہ آہستہ عظیم الشان مغل سلطنت کے فرماں رواؤں کو یوں بے بس کردیا کہ بالواسطہ طور پر خود حکمران بن گئی۔ اٹھارہ سو ستاون کے بعدواسطے کا یہ برائے نام سلسلہ بھی تمام ہوا اور اس خطے پر بلا شرکت غیرے انگریزوں کا سکہ چلنے لگا۔

جدید دور آیا اور اقتدار کا مفہوم بدلنے لگا۔ اب تلوار کے زور سے حکومت کرنے کازمانہ ختم ہورہا تھا۔ جمہوریت کے نام پرعددی اکثریت حکمرانی کا حق قرار پانے لگی۔ باوجود یکہ نظم ونسق میں صلاح ومشورہ کے لیے اہل ہند کی نامزدگی کا رواج ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا مگر انگریز حکام خاص حدود کے اندر اکثریت کی بنیاد پر پیش کئے گئے مطالبات کی پذیرائی کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے تاکہ بدنامی سے محفوظ رہ کر جس قدر ممکن ہو اپنے دور اقتدار کو طوالت دی جاسکے۔ بااثر ہندوؤں کا ایک طبقہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ایسے منصوبے بنانے لگا جس سے مسلمانوں کے تہذیبی آثار مٹاکر خالص ہندوانہ تہذیب کو رائج کیا جائے۔ ایسی ہی ایک کوشش 1867ء میں کی گئی جب بنارس کے سربرآوردہ ہندوؤں نے اردو زبان اور اسکے فارسی رسم الخط کی بجائے بھاشا زبان اور دیوناگری رسم الخط جاری کروانے کی ایک تحریک شروع کی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے الطاف حسین حالی لکھتے ہیں۔

"سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انہی دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیر سے، جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا "اب مجھ کو یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناداِن لوگوں کے سبب، جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہی گا وہ دیکھے گا۔ انہوں نے کہا، اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا، مجھے نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔" اسی موضوع پر ۱۸۷۰ء میں سرسید نے لندن سے نواب محسن الملک کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر کیا:

"ایک اور مجھے خبر ملی ہے جس کا مجھ کو کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دل میں جوش آیا ہے کہ زبان اردو خط فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے مٹا دیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ انہوں نے سائنٹفیک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک کی ہے، کہ بجائے اخبار اردو کے ہندی میں ہو تو ترجمہ کتب بھی ہندی میں ہو۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو مسلمانوں میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہونگے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار ہوا تو وہ اردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ، مسلمان علیحدہ ہوجائیں گے۔ یہاں تک تو کچھ اندیشہ نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ ہوکر اپنا کاروبار کریں تو مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوگا او ہندو نقصان میں رہیں گے ،اور اس میں صرف دوامر کا خیال ہے۔ ایک خاص اپنی طبعیت کے سبب کہ میں کل اہل ہند (کیا ہندو، کیا مسلمان) کی بھلائی چاہتا ہوں۔ دوسرے بڑا خوف اس بات کا ہے کہ مسلمانوں پر نہایت بداقبالی اور ادبار چھایا ہے۔ وہ جھوٹے اور لغو تعصب میں مبتلا ہیں اور وہ مطلق اپنے نقصان کو نہیں سمجھتے۔ اس پر حسد اور کینہ ان میں بآنہا بہ نسبت ہندوؤں کے اور جھوٹی شیخی زیادہ ہے اور کسی قدر مفلس بھی ہیں۔ ان وجوہات سے وہ ہرگز اس قابل نہیں ہونے کے جو اپنی بھلائی کیلئے کچھ

کرسکیں"۔

زبان ہی کے مسئلے میں ہندوؤں کی متعصبانہ کوششوں کے متعلق ۱۸۸۷ء میں سرسید ایک تعلیمی سروے رپورٹ میں لکھتے ہیں:

"تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری خواہش یہ تھی کہ دونوں مل کر دونوں فلاح کے کاموں میں کوشش کریں، مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو، جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے، مٹا دیا جائے۔ اس وقت سے مجھ کو یقین ہوگیا کہ اب ہندو و مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کرسکتے"۔ (۲)

سرسید کو دو قومی نظریے کا بانی یا حامی قرار دینے کیلئے مذکورہ بالا حوالے ہی بنیاد بنائے جاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب حوالہ اول میں بیان کردہ واقعہ کو "دوقومی نظریے کی ابتدا" قرار دیتے ہیں۔ (۳) رئیس احمد جعفری سرسید کو "دوقومی نظریے کا اصلی خالق" قرار دے کر ان کی جدوجہد کو "پاکستان کی خشت اول" سے تعبیر کرتے ہیں (۴)۔ صفدر سلیمی انہیں "پاکستان کا معمار اول" گردانتے ہیں (۵)۔ ہمارے بہت سے دوسرے دانشور بھی اسی قسم کا چرچا کرتے ہیں۔ اخباروں اور رسالوں میں یہی کچھ لکھا جاتا ہے۔ نصابی کتب کی وساطت سے طلبہ کو یہی تعلیم دی جاتی ہے اور علمی ادبی محفلوں میں بھی یہی کچھ سننے میں آتا ہے۔

سرسید کے الفاظ سے اپنی مرضی کے نتائج نکالنا ہمارے بعض دانشوروں کا کمال بن چکا ہے۔ ان کا فن اصل حوالوں سے بے نیاز ہے۔ مجبوری کی صورت میں سیاق وسباق کو چھپا دیا جاتا ہے۔ یا پھر ان کے مفہوم کو ایسے الفاظ کا لبادہ پہنایا جاتا ہے جس سے دوسروں کو اصل سے متضاد تاثر ملے۔ مندرجہ بالا حوالوں سے یہ بات عیاں ہے کہ سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے البتہ اپنے تاثرات کے ذریعے وہ تعصب کی مساعی کی مذمت کرتے ہیں۔ جب دونوں قوموں میں کسی لحاظ سے علیحدگی کا ذکر کرتے ہیں تو دکھ کا اظہار کرتے ہیں، ورنہ وہ ہردم ان دونوں کی برابر ترقی کے خواہاں ہیں۔ ان کے الفاظ اور مفہوم پر اچھی طرح غور کیجئے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اب ہندو ومسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کرسکتے" یہاں ملکی ترقی اور عوامی فلاح کا ذکر ہورہا ہے مگر ہم نے اپنی تصوراتی اڑانوں سے یہ اخذ کرلیا کہ ان الفاظ میں

ایک مشترکہ قومیت تخلیق کر سکیں گے۔ہندو اور مسلمان دو مختلف مذہبی معتقدات دو مختلف ادبیات اور دو مختلف النوع معاشرتی اطوار کے ماتحت ہیں۔ یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے ،نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں اور یہ بھی اصرار کے ساتھ کہے کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بلکہ اکثر متصادم ہوتے رہتے ہیں۔ حیات انسانی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی تمنائے ترقیات کے لیے مختلف تاریخوں سے شغف رکھتے ہیں۔ ان کے اس ذوق وشوق کے تاریخی وسائل اور ماخذ مختلف ہیں۔ دونوں قوموں کی رزمیہ نظمیں، ان کے سربرآوردہ بزرگ اور قابل فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ الگ ہیں۔ اکثر اوقات ایک قوم کا زعیم اور رہنما دوسری قوم کے بزرگ اور برتر ہستیوں کا دشمن ثابت ہوتا ہے۔ ایک قوم کی فتح دوسری قوم کی شکست ہوتی ہے، ایسی دو قوموں کو ایک ریاست اور حکومت کی ایک مشترکہ گاڑی کے دو بیل بنانے اور ان کو باہمی تعاون کے ساتھ قدم بڑھانے پر آمادہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں کے دلوں میں بے صبری روز بروز بڑھتی رہے گی جو انجام کار تباہی لائے گی۔"

پاکستان کا دو قومی نظریہ محض اس امر کی وضاحت نہیں تھا کہ مسلمان ہندوؤں سے ایک الگ قوم ہیں۔ اس میں غیر ملکی حکمرانوں سے مکمل آزادی بھی مطلوب تھی۔ یہ انگریزوں کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس کا مقصد ان سے نجات حاصل کرنا تھا۔ اس امر میں اس قافلے کے سالار اعلیٰ کے خیالات ملاحظہ فرمائیں جن کا اظہار انہوں نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ دہلی میں ۹ نومبر ۱۹۴۲ء کو کیا۔ "یہ ایک چھوٹا بر اعظم ہے جس میں مختلف لوگ اور قومیں آباد ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کبھی کسی ایک طاقت نے پورے ملک پر حکومت نہیں کی۔ اور اس زمانہ میں بھی جب کہ برطانیہ آئینی طور سے اس پر حکمران ہے۔ ایک تہائی ہندوستان برطانوی نہیں۔ ہندوستان کی انتظامی وحدت برطانیہ کی پیدا کردہ ہے۔ لیکن یہ حکومت جو ۱۵۰ یا ۱۶۰ سال سے یہاں قائم ہے عوام کی منظوری اسے حاصل نہیں۔ یہ ایک جمہوری نظام ہے جسے مغل نظام پر عائد کر دیا گیا ہے۔ اسے برطانوی سنگینوں کی حمایت حاصل ہے، عوام کی نہیں۔ اب لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہو چکا ہے۔ ہم اپنی آزادی چاہتے ہیں، ہم اپنی سرزمین کے خود مالک بننا چاہتے اور برطانوی اقتدار کو خیرباد کہنا چاہتے ہیں۔" اس کے برعکس سرسید انگریزوں کی حاکمیت کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہ کرتے

تھے ۔ وہ تمام عمر اس فلسفہ پر کاربند رہے کہ " ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے ۔ اس کی اطاعت اور فرماں برداری اور پوری وفاداری اور نمک حلالی جس کے سایہ عاطفت میں ہم امن وامان سے زندگی بسر کرتے ہیں ، خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے ۔ " اپنی وفات سے صرف چھ ماہ قبل سرسید نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا کہ " ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم گورنمنٹ انگریزی کے خیرخواہ اور وفادار رہیں ۔ اور کوئی بات قولاً وفعلاً ایسی نہ کریں جو گورنمنٹ انگریزی کی خیرخواہی اور وفاداری کے برخلاف ہو ۔ " اس کے جواز میں وہ مذہبی اسناد بھی پیش کیا کرتے تھے ۔ اس مضمون کی اشاعت کے ایک ہفتہ بعد وہ ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں :

" حدیث کی کتابوں میں متعدد حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ رسول خداؐ نے مسلمانوں کو نہایت تاکید سے نصیحت کی ہے اور فرمایا کہ تم اپنے امیروں اور حاکموں کی ہر حالت میں اطاعت کرو خواہ تمھارے ساتھ ظلم وستم ہوتا ہو یا وہ انصاف اور مروت سے پیش آتے ہوں ۔ ان حدیثوں میں حاکم یا امیر کے ساتھ کوئی شرط یا قید نہیں ہے ، جس سے یہ بات معلوم ہو کہ حاکم یا امیر کس مذہب کا ہو ۔ " اطاعت اور وفاداری کے اس جذبے میں وہ مظلوم کو آہ کی بھی اجازت نہیں دیتے ۔ وہ ایڈیٹر پایونیر کے نام ایک مکتوب میں ہندوستان کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

کہ " اگر بالفرض گورنمنٹ انگریزی کی جانب سے کچھ دست اندازی بھی ہو تو ان کے حق میں یہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنے ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں ، نہ کہ گورنمنٹ کے مقابلہ میں بغاوت اختیار کریں "

اپنی تفسیر القرآن میں اس امر کی مذہبی سند انھوں نے یوں پیش کی ہے ، " جو لوگ اس ملک میں جہاں بطور رعیت کے رہتے ہوں یا امن کا اعلانیہ یا ضمنا اقرار کیا ہو اور گو بوجہ اسلام ان پر ظلم ہوتا ہو تو بھی ان کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی ۔ یا اس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں ۔ " کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کی اطاعت اور ان سے غیر مشروط مفاہمت کی یہ حکمت عملی سیاسی مصلحتوں کے تابع تھی اور سرسید اس طرح مسلمان قوم کو آزادی کے لیے تیار کررہے تھے ۔ دوسرے الفاظ میں وہ انگریز قوم کو بے وقوف ظاہر کرنا چاہتے ہیں جو ان کی یہ چالاکی نہ سمجھ سکی ۔ ساری دنیا میں انگریزوں کی سیاسی دور اندیشی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ یہ امر ناممکن ہے کہ وہ کسی ایسی تحریک کی مالی اور سیاسی سرپرستی کرتے جو بالآخر انہی کے زوال پر منتج ہوتی اور اس طرح وہ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارتے ۔ ہندوستان میں انگریزوں کی ساری تاریخ ان دلائل کی نفی کرتی ہے ۔ سرسید کی پالیسی ان کی اپنی سمجھ کے مطابق اخلاص پر مبنی تھی ۔ ان کی خواہش تھی کہ " ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل)

(Eternal) ہونی چاہیئے۔" حیرت ہے کہ واضح حقائق کی موجودگی کے باوجود بعض اہل قلم تحریک آزادی کے ذکر میں ان لوگوں کو بھی ہیرو بنا کر پیش کر دیتے ہیں جنہوں نے آزادی کی روح کو کچلنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور دامے درمے، قدمے، سخنے عوام کی غلامانہ زندگی کو طوالت بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔ متعدد معروف مصنفین کی تحریروں کے علاوہ اس کی ایک مثال آج ہم جی الانا کی انگریزی کتاب "ممتاز مسلمان مجاہدین آزادی" میں دیکھتے ہیں۔ جس میں سرسید احمد خان بہادر کو جہاد آزادی کے ایک قابل ذکر رہنما کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ دراصل سرسید کو سن ستاون کی جدوجہد کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی حالت زار نے اس پالیسی کو اپنانے پر مجبور نہیں کیا بلکہ وہ اس سے کئی سال قبل سے ہی اس نظریے پر کارفرما تھے۔ ایڈیٹر پایونیر کے نام اپنے ایک مکتوب میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ " جو میری آرا اور خیالات برٹش گورنمنٹ کی نسبت ہیں ان کے اصول میرے بیٹے سید محمود کی پیدائش سے بہت پہلے قائم ہو چکے تھے۔" واضح ہو کہ سید محمود کا سن پیدائش ۱۸۵۰ء ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۹۴ میں انہوں نے انگریزوں کے ساتھ اپنی وفاداری کے جذبات کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ "میری یہ رائے آج کی نہیں بلکہ پچاس ساٹھ برس سے میں اسی رائے پر قائم اور مستقل ہوں۔"

سرسید کے مندرجہ بالا بیانات کی موجودگی میں یہ دعویٰ کرنا کہ یہ پالیسی انہوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی حالت زار سے متاثر ہو کر اختیار کی۔ مضحکہ خیز ہے۔ ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ اس صورتحال نے ان کے عزائم کو تقویت پہنچائی اور ان کے لیے مسلمان قوم کی قیادت سنبھالنے کی راہ ہموار کی۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ کثیر الاقوام معاشرے میں کسی مذہب کے پیروکار اکثر و بیشتر اپنے ہم مذہب سیاسی قائدین کی تقلید کو ترجیح دیتے ہیں۔ جیسا کہ سرسید نے خود بیان کیا ہے کہ

" برٹش رول (Rule) کے ساتھ میری وفاداری اور محبت کی آزمائش ۱۸۵۷ء کے مصائب میں ہوئی تھی۔ انگریزوں کا سند یافتہ خیر خواہ ہونے کے باعث انہیں حکمرانوں کی طرف سے مکمل تعاون اور اعتماد حاصل تھا۔ اسی رسوخ کی بدولت وہ قوم کو ایک خاص عرصے تک اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب ہوئے۔ بقول حالی " اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسید کی تمام کامیابیوں کا مدار اسی رسوخ اور اعتبار پر تھا تو بھی اصل سبب ان کی راست بازی اور سچائی ٹھہرے گی کیونکہ برٹش گورنمنٹ میں میٹو (Native) کا اس قدر رسوخ اعتبار پیدا کرنا، جب تک کہ اس کی وفاداری اور خلوص کا سونا سخت امتحان کی آگ پر تایا نہ گیا ہو ہرگز ممکن نہیں۔" انہوں نے انتہائی خلوص کے ساتھ انگریزی حکومت کے استحکام کی کوششوں میں حصہ لیا جو اصلاحی کارنامے انجام دیئے انکے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔

انکی مساعی کا تحریک پاکستان سے ناطہ جوڑنا حقائق کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ دو قومی نظریہ سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ثبوت کے طور پر مزید حوالے ملاحظہ ہوں:

"اس وقت ہندوستان میں خدا کے فضل وکرم سے دو قومیں آباد ہیں اور اس طرح سے ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے، ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے، ایک آب وہوا کے شریک ہیں، ایک دریا یا کنوئیں کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج وراحت کا شریک ہوتا ہے، ایک دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں ..... پرانی تاریخوں میں، پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں

یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک ہی قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گوان میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آکر بس جاتے ہیں مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے، گو ان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو۔ کیا اس زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اس زمین میں تم دفن نہیں ہوتے ہو یا اسی زمین کے گھاٹ پہ جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی، جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ " تمام انسان بالکل شخص واحد ہیں اور میں " قوم " کی خصوصیت کے واسطے مذہب اور فرقہ اور گروہ پسند نہیں کرتا"۔

بعض قلم کار علی گڑھ کالج کے قیام کو دو قومی نظریے کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ غالباً اس سے وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ کالج صرف مسلمانوں کی تعلیم کے لیے مختص تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے قبل ہندوؤں کے نام پر بھی تعلیمی ادارے موجود تھے، یہاں تک کہ بنارس ہندو یونیورسٹی قائم ہوگئی، مگر ان کے وجود کو کسی نے دو قومی نظریے کی بنیاد قرار نہ دیا۔ دراصل مختلف قوموں کے نام پر قائم کئے گئے اداروں میں ہر قوم کے افراد تعلیم پاتے تھے۔ مدرسۃ العلوم کی بھی یہی کیفیت تھی۔ پھر ان قوموں نے الگ الگ قوم کی نام پر مدرسے کیوں قائم کئے؟ اس کا جواب سرسید کے مندرجہ ذیل بیان سے اخذ کیا جاسکتا ہے:

" مدرسۃ العلوم بے شک ایک ذریعہ ترقی قومی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف

مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ مدرسۃ العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کی درست کرنے کیلئے اور جو افسوس ناک محرومی ان کو یورپین سائنسز اور لٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی، اس کے رفع کرنے کو قائم کیا گیا مگر اس میں ہندو مسلمان دونوں پڑھتے ہیں اور تربیت جو ہندوستان میں مقصود ہے دونوں کو دی جاتی ہے۔" اس کے جواز میں انہوں نے یہ دلیل پیش کی:
ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے۔ پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پائیں، ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پئیں، ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پائیں، ایک ہی طرح کے وسائل ترقی دونوں کیلئے موجود نہ کیے جائیں، ہماری عزت نہیں ہوسکتی۔ مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں میرا یہی مطلب تھا۔" ایک اور موقع پر سرسید نے اس مطلب کو یوں بیان کیا:

"مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو اس کالج کے قائم کرنے کا ہوا تھا جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں آپ بھی واقف ہیں کہ مسلمان روزبروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے جاتے تھے۔ ان کے مذہبی تعصبات نے ان کو اس تعلیم سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں مہیا کی گئی تھی اور اسی وجہ سے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ ان کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جائے۔ اس کی مثال اس طرح پر دی جاسکتی ہے: فرض کرو کہ دو بھائی ایسے ہیں جن میں سے ایک بالکل طاقت ور اور تندرست ہے اور دوسرا بیمار ہے اور اس کی تندرستی زوال پہ ہے۔ پس اس کے تمام بھائیوں کا یہ فرض ہوگا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کریں اور اس کو مدد دیں۔ یہی خیال تھا جس نے مجھ کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قائم کرنے میں آمادہ کیا۔ مگر میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک ہی سی تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے تمام حقوق جو اس شخص سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے، بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے۔ صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کرسکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے اس کو حاصل کرے۔ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں اور دونوں کی نسبت بطور بورڈر کے یکساں طور پر سلوک کیا جاتا ہے۔" صرف یہی نہیں، جہاں مسلمان طلبہ کی ہمت افزائی کیلئے کسی جانب سے کوئی امتیاز سلوک کیا گیا تو انہوں نے اپنی جانب سے ہندو طالب علموں کو بھی اسی سلوک کا مستحق

قرار دیا۔ ان کے ایک خط کا مندرجہ ذیل اقتباس اس صورت حال کی وضاحت کرتا ہے:

"امرت سر (پنجاب) کے چند مسلمانوں نے یہ پیش کش کی ہے کہ ہمارے کالج جو مسلمان طالب علم بی اے کے آئندہ امتحان میں اول درجے میں کامیاب ہوگا اسے طلائی تمغہ عطا کیا جائے گا۔ میں اس ہندو طالب علم کو جو بی اے کے آئندہ امتحان میں اول درجے میں کامیاب ہوا اسے اپنی جیب سے طلائی تمغہ کی پیش کش کرتا ہوں۔" سرسید کی نگاہوں میں دونوں قومیں مساوات کے جس اعلیٰ مقام کی حقدار تھیں اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتا ہے:

"میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔ اس کہنے کو بھی میں پسند نہیں کرتا کیونکہ لوگ علی العموم یہ فرق قرار دیں گے کہ ایک کو دائیں آنکھ اور دوسری کو بائیں آنکھ کہیں گے مگر میں ہندو اور مسلمانوں دونوں کو بطور ایک آنکھ سے سمجھتا ہوں۔ اے کاش میرے صرف ایک ہی آنکھ ہوتی کہ اس حالت میں عمدگی کے ساتھ انکو اس ایک آنکھ کے ساتھ تشبیہہ دے سکتا۔"

پاک بھارت سرحد کی دونوں جانب سرسید کے شیدائی کثیر تعداد میں بستے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں سرسید کے تصور قومیت کا ذکر اپنے اپنے ملکی نظریات کے مطابق کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں انہیں دو قومی نظریے کا بانی قرار دیا جاتا ہے تو سرحد پار کے باسی انہیں متحدہ قومیت کا علمبردار بتاتے ہیں۔ ہمارے مصنفین کی تحریروں میں اس اختلاف کا ذکر بوجوہ نہیں ملتا مگر بھارتی مصنف اکثر اس کی نشان دہی کردیتے ہیں۔ سرسید کے نظریے سے اتفاق یا اختلاف اپنی جگہ پر مگر ہر انصاف پسند ان کے تجزیے کو درست ماننے پر مجبور ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی تحریر کرتے ہیں:

"سرسید کی فکر کا ایک نہایت ہی اہم پہلوان کا تصور قومیت ہے۔ انہوں نے دو بنیادی حقیقتوں کو اس سلسلے میں بار بار دہرایا ہے۔ ایک یہ کہ قوم مذہب سے نہیں بنتی، دوسرے یہ کہ ہندوستان میں بسنے والے سب ایک قوم ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ پہلے نظریہ کہ پرزور تائیدان کے انتقال کے ۴۰ سال بعد دیوبند سے ہوئی جب مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے اعلان کیا کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں اور علامہ اقبال نے اس کی پرزور تردید کی۔ غالباً آج بھی متحدہ قومیت کا تصور اس سے آگے نہیں پہنچا جہاں سرسید نے پہنچادیا تھا۔"

اور اب آخر میں علی گڑھ سے شائع ہونے والی سرسید کی ایک تصنیف میں درج انتساب کے الفاظ جن سے اگر عقیدت کے تاثر کو الگ کردیا جائے تو قومیت کے مسئلے پر سرسید کے خیالات کے صحیح ترجمان ہیں: "سرسید کی روح کے نام جس نے ہندوستانیوں کو متحدہ قومیت کا تصور بخشا"۔